مشکلات القرآن

محمد حنیف ندوی

ایک آیت

وَقَالُوا لَن يَدخُلَ الجَنَّةَ اِلَّا مَن كَانَ هُودًا اَو نَصٰرٰى تِلكَ اَمَانِيُّهُم قُل هَاتُوا بُرهَانَكُم اِن كُنتُم صٰدِقِينَ ○ بَلٰى مَن اَسلَمَ وَجهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحسِنٌ فَلَهٗٓ اَجرُهٗ عِندَ رَبِّهٖ وَلَا خَوفٌ عَلَيهِم وَلَا هُم يَحزَنُونَ ○ (بقرہ ۱۱۳)

اور یہ کہتے ہیں۔ جنت میں تو وہی داخل ہو سکتا ہے، جو یہودی یا عیسائی ہو۔ کہہ دیجئے، کہ یہ ان کی آرزوئیں ہیں (جو پوری ہونے والی نہیں) جنت میں وہ شخص جائیگا۔ جس نے اپنے کو اللہ کے لئے وقف کر دیا۔ بشرطیکہ وہ محسن ہو؟ اس کا اجر عند اللہ ثبت ہے۔ ایسے لوگوں کو کسی طرح کے حزن و خوف کا سامنا کرنا نہیں۔

کہنے کو تو یہ ایک آیت ہے، لیکن غور سے دیکھئے تو اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دینی پندار کی پوری داستان موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں اس حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ مذہب و دین کے بارے میں اجارہ داری نہیں! بات یہ ہے کہ اسلام جب آیا تو اس وقت دو قومیں تھیں جو مذہب سے بظاہر آشنا تھیں۔ جو خدا اور وحی کے تصور کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کرتی تھیں۔ اور اس سچائی پر بہرحال ایمان رکھتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے عقل و خرد کے سوا بھی کچھ دروازوں کو انسانی ہدایت کے لئے کھول رکھا ہے۔ اس لئے قرآن نے خصوصیت سے ان دو قوموں کے دینی و مذہبی احوال کا تجزیہ فرمایا ہے۔

اس کے باوجود کہ یہ دو گروہ مذہب کے نام لیوا تھے۔ ان میں قباحت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ انھوں نے جن عقائد و افکار کو اپنا رکھا تھا، ان میں تعصب، تنگدلی اور زعم بے جا ایسے تمام لوازم تو پائے جاتے تھے جو کسی قوم کے عہدِ انحطاط میں خود بخود اُبھر آتے ہیں۔ لیکن دین اور اس کی اصلی روح، اور حقیقی معقولیت سے قطعی بے گانہ تھے۔ اور اب کیفیت یہ تھی کہ عبادات، رسوم اور تقریبات کے قبیل سے ان میں جو کچھ بھی مروج تھا وہ اور سب کچھ ہو سکتا تھا۔ مگر صحیح معنوں میں مذہب و دین نہیں ہو سکتا تھا۔

یہودیوں کی بیماری یہ تھی کہ ان کے نزدیک مذہب اور زندگی دو الگ الگ خانوں میں منقسم تھے۔ دین اور مذہب کی پابندی ان کے ہاں صرف اس سے تعبیر تھی کہ جسمانی پاکی و طہارت کے کچھ مسائل از بر ہوں، رسوم میں حصہ لیا جائے، قومی مقاصد کو زندہ رکھا جائے اور فضیلت و برتری کی جملہ خوبیوں کو اسرائیل کے گھرانے میں محصور سمجھا جائے۔ نیز اگر ممکن ہو تو تورات کے بعض ان احکام کو مان لیا جائے جن کے مان لینے سے کسی پر کوئی مالی یا اخلاقی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

رہا یہ مسئلہ کہ آپ اکل حلال کی اہمیتوں کو محسوس کرتے ہیں یا نہیں۔ دوسروں کا مال ناجائز ذرائع سے ہتھیا لینے میں کبھی ضمیر کی

ملامت و سرزنش سے دو چار ہونا پڑتا ہے یا نہیں ۔ اور بنی اسرائیل کے سوا کسی اور قوم اور ملت کو بھی اپنی انسانیت کا سزاوار قرار دیتے ہیں یا نہیں ۔ تو اس انداز کی ہر خلش سے ان کا ذہن کلیتہً آزاد تھا ۔

عیسائیوں کا مرض دوسری قسم کا تھا ۔ یہ خاص قومیت اور نسل و دائرے کے تعصبات کے بجائے اذعانات ——— (DOGMAS) پر مٹے ہوئے تھے ۔ اور محض ایمان پر زور دیتے تھے ۔ ان کے خیال میں انسانی نجات کیلئے عمل کوئی اہمیت نہیں رکھتا شریعت اور قاعدہ و قانون کی حد بندیاں بے معنی ہیں ۔ زندگی اور سیرت کا بندھا ٹکا نقشہ بے کار ہے ۔ کوئی متعین نظام اور فلسفۂ حیات مفید نہیں ۔ آپ اگر تثلیث کے قائل ہیں چاہے اس کو آپ کا ذہن قبول کرے یا نہ کرے حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارے پر ایمان رکھتے ہیں خواہ اس کی منطق آپ کو نہ جچے ۔ اور کسی نہ کسی کلیسا سے وابستہ ہیں اگرچہ اس وابستگی سے زندگی میں کوئی صحتمند تغیر نہ رونما ہوا ہو ۔ تو نجات قطعی ہے ۔ ورنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی محرومی قسمت کا ماتم کیجئے ۔

گویا دونوں گروہ حقیقت دین سے بے گانہ اور مذہب کے اصلی تقاضے سے بے بہرہ تھے ۔ یہودیت کی دعوت تعصب لفظ پرستی اور رسوم و عوائد پر مبنی تھی اور عیسائیت کی دعوت چند نہ سمجھ میں آنے والے ایمانیات پر قائم !

اس زبوں حالی اور کچی مذہبیت کے فقدان پر اگر یہ ہوتا کہ یہ قومیں اپنے اس انحطاط کو محسوس کرتیں ۔ اور یہ دیکھتیں کہ اسلام نے کس درجہ حیرت انگیز انقلاب کو جنم دیا ہے تو قرآن حکیم ان کے حالات سے تعرض نہ کرتا اور انکے طویل و عریض دعاوی کا یوں جائزہ نہ لیتا لیکن ہوا یہ کہ یہ لگے دون کی لینے اور یہ سمجھنے کہ محاسن خیر کے جس مقام پر ہم کھڑے ہیں مسلمانوں کی رسائی وہاں تک کہاں ؟ اور یہ کہ نجات اخروی کا استحقاق ہمارے سوا اور کسی کو نہیں !

قرآن حکیم نے اس غلط فہمی اور پندار و زعم کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ نجات خواہشات یا آرزوؤں سے حاصل ہونے والی نہیں ۔ اور صرف تمناؤں اور دعووں سے کبھی کسی قوم نے روح و عمل کی بلندیوں کو نہیں پایا ۔ کیونکہ اگر نجات کے معنی یہ ہیں ۔ کہ فکر و ذہن میں ایک طرح کا سلجھاؤ پیدا ہو ، قلب اونچے افکار اور نصب العینوں کا خزینہ ہو ، دنیا کے معاملہ میں ایسا متوازن موقف اختیار کیا جائے کہ جو نہ تو زندگی کی نفی کرے اور نہ ایسا ہو کہ حرص و آز کی دستوں کو بڑھاوے ۔ اور اگر نجات یکایک حاصل ہونے والی چیز نہیں بلکہ ایک طرح کی تدریج اور باقاعدگی کی طالب ہے اور اس کا ظہور اسی دنیا فانی میں ہونا چاہیئے تب ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کیلئے عقائد و تصورات کا ایک نقشہ قائم کیا جائے اور سیرت و اعمال کا ایک خاکہ مانا جائے وہ صرف الفاظ و دعاوی اور چھاپ اور لیبل سے ہاتھ آنے والی چیز نہیں !

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نجات کے بارہ میں انکے مزعومات کو امانی کے نہایت جامع لفظ سے تعبیر فرمایا یعنی مجرد خواہشیں اور آرزوئیں جو کبھی شرمندہ وجود نہیں ہوتیں ۔ امانی کا اطلاق ہر طرح کی خواہشوں پر نہیں ہوتا بلکہ اس سے مراد ایسی خواہشیں ہیں ۔ جو نہ تو پوری ہونے والی ہوں اور نہ معقول ہوں ۔ اسی عدم معقولیت کی بنا پر قرآن حکیم نے برہان کا مطالبہ کیا ہے ۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح کی آرزوؤں کو دل میں پالنے سے پہلے اس پر تو غور کر لو کہ فی نفسہٖ ان میں کوئی وزن اور استواری بھی ہے یا نہیں ؟ اور یہ کہ نجات کا یہ تصور تمہارے کچھ کام بھی آسکتا ہے یا نہیں ؟

لفظ "امانی" کے بارہ میں ایک اور نکتہ غور طلب ہے اور وہ یہ کہ جب عیسائیوں اور یہودیوں کی نجات کا مسئلہ صرف ایک ہی مسئلہ ہے اور قرآن نے بھی اس کے سوا کسی دوسرے مسئلے کا ذکر نہیں کیا، تو یہ ایک آرزو ہوئی۔ "امانی" جو جمع کا صیغہ ہے اسکے جواز کیا دلیل ہے؟ جواب کچھ مشکل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بظاہر یہ ایک ہی آرزو یا "امید" ہے لیکن یہ ایک آرزو، کئی آرزوؤں کو مستلزم بھی ہے۔ کیونکہ جب یہ دونوں گروہ نجات کو صرف ان سے ہی دائروں میں سمٹا ہوا سمجھیں گے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان میں دینی پندار اور زعم باعمل بھی ہے۔ یہ اپنے گروہ کو دوسرے گروہوں سے بہتر و افضل بھی خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا انکو متعصب و تنگ نظر بھی کہہ لیجئے تو درست ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ زندگی کے مسائل میں یہ حد درجہ کے متساہل ہیں اور مذہب و دین ایسی اہم حقیقت سے متعلق یہ سوئے ظن رکھتے ہیں کہ اس سے روح کی بیداری، حقیقی کردار اور ذہن و فکر میں کوئی جلا اور تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ صرف کھوکھلے دعاوی اور مزعومات باطلہ کا گورکھ دھندا ہے اور بس۔ اس طرح گویا یہ ایک آرزو اور ایک غلط فہمی، متعدد آرزوؤں اور غلط فہمیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے اسی مناسبت سے اس کو "امانی" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

آیت کی پوری پوری وضاحت نہیں ہو سکے گی۔ اگر یہ نہ بتایا جائے کہ قرآن حکیم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں کیا موقف اختیار کیا کیونکہ دونوں کی راہیں جدا جدا ہیں۔ یہودی اگر شریعت کے ظاہری قالب کو اہم سمجھتے تھے تو عیسائیت نے اس کے بجائے روح اور معنویت کو مدار و محور گردانا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کیا کہتا ہے آیا اس کی دعوت ظواہر شریعت کی دعوت ہے یا عیسائیت کی اصطلاح میں روح و معنی کی۔ قرآن کا اختیار کردہ مسلک اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے۔ اس کے نزدیک یہ دونوں چیزیں برابر کی اہمیت رکھتی ہیں۔ نہ ظواہر شریعت سے اغماض برت کر روح و معنی کی تشکیل ممکن ہے۔ اور نہ روح و معنی سے دستکش ہو کر زندگی کو صحتمند سانچوں میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لفظ "محسن" سے یہی مراد لیا ہے۔ قرآن کے پیغام اور دعوت پر غور کیجئے گا۔ تو ان دونوں پہلوؤں کی اہمیت کا کما حقہٗ احساس ہوگا۔ اور ثابت ہوگا کہ وہ دونوں کو دینی و روحانی زندگی کے ناگزیر اجزاء قرار دیتا ہے۔ ایک طرف اگر اس کی دعوت متعین تصورات و عقائد، عبادات اور رسوم و مسائل کی ہے تو دوسری طرف وہ ان عبادات کو بے کار بھی ٹھہراتا ہے۔ جو روح و معنی سے تہی ہوں۔

فویلٌ للمصلین الذین ھم عن صلوٰتھم ساھون ۝

ان نمازیوں کیلئے ویل و ہلاکت ہے جو نمازوں میں غفلت و سہو سے کام لیتے ہیں۔

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم۔

خدا تک نہ تو قربانی کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون۔ اس تک رسائی حاصل کرنے والی چیز محض تمہارا تقویٰ ہے۔